

دلی کی
دوسو برس کی تاریخ

تیمور کے حملے سے قبل

مقالہ

اردو اکادمی ، جامعہ ملیہ اسلامیہ ، دھلی

۱۹ جنوری ۳۶ء

از

مولوی سید حسن برنی صاحب - ایم ، اے - ایل ایل ، بی

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - دھلی



دلّی کی دو سو برس کی تاریخ

تیمور کے حملے سے قبل

مقالہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

از

مولوی سید حسین برنی صاحب ایم اے ایل ایل بی

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

تمہید

دہلی کی دو سو برس کی ابتدائی تاریخ پر ہمہ گیر بحث ایک مختصر مقالہ میں ناممکن ہے۔ اور تمام شواہد و اسناد کا حوالہ اور ان کی قدر و قیمت کی جانچ پرتال بھی دشوار ہے۔ میں بیس برس سے اسکی تدوین میں لگا ہوا ہوں اور ایک مفصّل و مبسوط کتاب انگریزی میں لکھنا چاہتا ہوں جو آثار و تمدن کی تاریخ پر حاوی ہو۔ فی الحال موجودہ مقالہ میں صرف ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور معلومات و آراء میں استدلال و استشہاد کو زیادہ تر نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس وقت اس دور میں دارالسلطنت کے تمدن پر بھی کچھ نہیں لکھا ہے جس پر اگر ممکن ہوا تو کسی وقت دوسرا مقالہ پیش کرنیکی عزت حاصل کروں گا۔ اس مقالہ میں تمام تر دہلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی گئی ہے، اور ان کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائے فنون میں ان کی جگہ اور قدر و قیمت دکھانے کی بھی کچھ کوشش کی گئی ہے لیکن یہ بحث بہت سے نظریوں کی آماجگاہ اور زیادہ تفصیلات کی محتاج ہے، ہمارے تمدن کی طرح ہمارے فنون بھی جنکا نشو و نما اس ملک میں ہوا، جداگانہ وجود رکھتے اور اپنی خصوصیات میں خالص ہندی اور خالص اسلامی نمونوں سے متاثر ہیں اور انتہ بدیہی طور پر کہ ہر شخص

پبلک نظر انھیں باہر کے نمونوں سے جدا پاتا ہے لیکن ان کے نشو و نما اور ارتقائی تاریخ ابھی تک اتنی واضح نہیں ہے۔

اس ناچیز مقالے کو لکھنے اور پیش کرنے میں مجھے بہت کچھ پس و پیش ہے، اپنی علمی تہی مائگی سے بھی اور اس خیال سے بھی کہ نئی نسلوں کے سامنے زندگی کے بہت سے عملی مسائل ہیں جن کا حل مقدم ہے، اور انھیں سے اس زمانہ میں زیادہ تر بحث کرنا زیادہ مفید و مناسب۔ پھر بھی یہ سوچتا ہوں کہ اپنا ماضی بالکل بھلا دینے کی چیز بھی نہیں ہے، اور کبھی کبھی داستانِ پارینہ کو دوہرا کر سینہ کے داغوں کو ہرا رکھنا اور قوم و ملک بلکہ نسل انسان کے کارناموں سے آئیندہ کی ترقیات کے لئے سبق لینا خالی از فائدہ نہیں ہے۔

ہر چند کہ دہلی کو ملکی تاریخ میں وہی رتبہ حاصل ہے جو قدیم زمانے کی تواریخ میں ایتھنس
اور روما اور عربوں کی تاریخ میں دمشق، بغداد، قاہرہ قرطبہ و غرناطہ کو حاصل ہے
اور اس کے باقیماندہ آثار بھی شمار و دلچسپی میں ان قدیم تر دار السلطنتوں کے آثار
باقیہ سے کچھ کم نہیں ہیں لیکن دہلی کی تاریخ اصلی ماخذوں سے از سر نو لکھی جانی
باقی ہے، بالخصوص ان پہلی دو صدیوں کی۔ جن سے ہمارا مقالہ تعلق رکھتا ہے
دوسرے بلاد اسلامیہ کے عرب مصنفوں کو مقامی تاریخ سے خاص شغف تھا
چنانچہ بغداد و دمشق اور دوسرے بلاد مثلاً خوارزم نیشاپور و اصفہان کے
متعلق بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئی تھیں جس میں سے کچھ ہم تک بھی پہونچی
ہیں، جیسے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد، اور ابن عساکر کی تاریخ دمشق،
ان میں علاوہ نامور رجال کے حالات کے جو ان کا خاص مقصد ہوتا ہے،

دوسری مرتب ومنتشر معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ جوان بلاد وممالک کی اثری و تمدنی تاریخ کے لئے بسا کار آمد ہیں۔ ان کے سوا عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کی تصانیف ہیں۔ جو ٹھوس اور قیمتی معلومات سے مملو ہیں، لیکن خالص ہندوستانی تاریخ نویسی و جغرافیہ نگاری کی روایت اتنی اونچی سطح پر شاید کبھی نہیں پہونچی۔ چنانچہ کسی معاصر اہل قلم نے خاص طور پر اس دور کی، دہلی کی مقامی تاریخ نہیں لکھی اور بعد کے آنیوالوں، حتیٰ کہ فاضل اجل علامی ابوالفضل نے اپنی آئین اکبری میں دہلی کے متعلق جو لکھا ہے وہ بہت تھوڑا سرسری معلومات پر مبنی اور بہترین تحقیقات سے عاری ہے رہیں جدید دہلی کی تواریخ تو ان میں اکثر نقل در نقل کا نقص محسوس ہوتا ہے، اور اصلی و بنیادی ماخذوں کی تلاش اور ان سے باقاعدہ استفادہ کم پایا جاتا ہے۔

ان دوسو برس کی دہلی کی تاریخ مغلیہ دور کی طرح یکسانیت تو نہیں رکھتی لیکن تنوع اور دلچسپی کے لحاظ سے اس سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس دور کی بہت کم آثار اپنی اصلی حالتوں میں ہم تک پہونچے ہیں، لیکن جو ہیں، ان میں سے بعض مثلاً قطب مینار اور مسجد اپنی شان وشوکت اور خوشنمائی کی وجہ سے عجائبات میں شمار ہونے کے لائق ہیں، اور بعض میں ایسی فنی خصوصیات ملتی ہیں۔ جن کا بعد کے ماہرین اور اساتذہ مقابلہ نہیں کرسکے نہ ان سے آگے بڑھ سکے جیساکہ مغربی سیاح ابن بطوطہ نے بتایا ہے دہلی سے اس کے زمانہ

تک اُسی شہر سے مراد تھی جس کی بنا ہندوؤں نے ڈالی تھی، اور جسے فتح کے بعد مسلمانوں نے اپنا دارالسلطنت بنالیا تھا لیکن امتداد زمانہ سے ان دو سو برس میں یعنی تیمور کے حملہ تک، یکے بعد دیگرے پانچ اور شہر جدا جدا ناموں کے ساتھ اور الگ الگ موقعوں پر پیدا ہو گئے تھے۔ اور ان سب پر بحیثیت مجموعی دہلی کا اطلاق باسموم ہوتا تھا۔ [علہ]

ا۔شہر نو کیلوکھری جس کی بنا کیقباد کے زمانہ میں پڑی اور اس کا اور اس کے بعد جلال الدین خلجی کا دارالسلطنت رہا کل دس برس تک،

۲۔ سیری جس کی بنا علاؤالدین خلجی نے ڈالی اور تکمیل قطب الدین خلجی نے کرکے الخلافہ سے موسوم کیا تھا۔ صرف بیس برس تک دارالسلطنت رہا۔

۳۔تغلق آباد جس کو غیاث الدین تغلق نے بنایا، اور صرف اس کے زمانہ میں چند سال دارالسلطنت رہا اور ابتدائی زمانہ میں محمد تغلق کا بھی دارالحکومت تھا۔

۴۔جہاں پناہ، جسے محمد تغلق نے آباد کیا اور اس کے زمانہ میں زیادہ تر دارالسلطنت رہا،

۵۔شہر فیروز آباد، جسے فیروز شاہ تغلق نے اپنی سلطنت کے آغاز میں ہی بنایا تھا، اور تقریباً چالیس برس سے زیادہ دارالسلطنت رہا۔

علہ ص ۱۹ متن عربی مطبع الخیریہ ۱۳۲۲ھ ص ۳۹ ترجمہ اردو ۱۸۹۸ء

اتنی جلد جلد پچھلے سو برس میں دارالسلطنت کا تبدیل ہونے کا باعث کچھ تو آبادی کی روز افزوں کثرت تھی اور کچھ اس زمانہ کے منچلے بادشاہوں کی ناموری کی آرزو۔ ابن بطوطہ نے صراحت سے لکھا ہے کہ ہندوستان میں دستور تھا کہ ہر بادشاہ اپنے لئے نیا محل بناتا تھا، اور پرانے محلات غیر آباد ہو جاتے اور ان کا بیش قیمت ساز و سامان انھیں میں پڑا خراب ہوتا رہتا تھا۔ اسی افسوسناک حالت میں اس سیاح نے بلبن کے مشہور کوشک لعل کو پایا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک اندلسی عربی بھی تھا جو ہندوستان میں پہلے سے رہتا تھا

ان میں سے شہر نو اور سیری تو بالکل نیست و نابود ہو گئے اور باقی کے کم و بیش کچھ آثار باقی ہیں۔

لیکن جس وقت یہ شہر آباد تھے تو ان میں ہر ایک اپنے اپنے حصاروں سے محصور تھا ہر ایک میں شاہی محلات، جامع مسجدیں، مدرسے کاروانسرائیں خانقاہیں اور شفاخانے اور بادشاہوں اور امرا و فقرا کے بڑے بڑے مقابر تھے، جن کے ساتھ وسیع اوقاف اور خدمتگزاروں کی جماعتیں وابستہ ہوتی تھیں۔ اس قسم کی یادگاروں کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ابن بطوطہ کے لکھے ہوئے حالات مقبرہ قطب الدین خلجی پڑھنے چاہئیں۔ اس کا انتظام خود

عہ ص ۵۸ متن عربی و ص ۱۲۴ ترجمہ

ابن بطوطہ کے سپرد تھا[۱]۔ ان تمام دارالسلطنتوں کی شاہی مسجدیں اپنی وسعت و شان میں ایک دوسرے سے بازی لیجاتی تھیں لیکن سب پر تفوق قدیم ترین جامع مسجد ہی کو حاصل تھا جس کے تھوڑے سے بچے ہوئے آثار اس کی قدیم عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں، تاریخی اسناد سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کی جامع مسجدیں اپنی کثرت و شوکت کے لحاظ سے باہر والوں کو اچنبھے میں ڈالتی تھیں۔ اور میری رائے میں تو ان کے نمونوں پر ہندوستان کے مشرقی و مغربی، و جنوبی قطعات ہند کی بڑی مسجدیں بنائی گئی ہیں۔ چنانچہ جونپور کی قدیم مسجدیں جو مشرقی نمونۂ تعمیرات کے نام سے موسوم ہیں اور دکن کی قدیم ترین مسجدیں گلبرگہ و بیدر کی یقیناً دہلی کے نمونوں سے اثر پذیر ہوئی ہیں۔

ان قیمتی آثار کی بربادی کچھ زمانہ کے ہاتھوں ہوئی لیکن ان میں بہت سی اگر اپنے حال پر چھوڑ دی جاتیں تو وہ وقت کا حملہ برداشت کرنے کے قابل تھیں۔ لیکن زیادہ نقصان جنگ و امن دونوں حالتوں میں انسانی ہاتھوں سے پہونچا، کچھ آتش انتقام کے نذر ہوئیں۔ بہت سی مسمار کر دی گئیں اور ان کے مسالے نئی عمارتوں کے کام آئے، جیسا کہ فیروز شاہ، شیر شاہ۔ اکبر و شاہجہاں کے وقتوں میں ہوا، کوئی شبہ نہیں ہے کہ کیلوکھری کے شاہی

---

[۱] ص ۱۰۷ متن ص ۲۲۵ ترجمہ

کوشک اور دوسری عمارات کا مسالہ مقبرہ ہمایوں کے بنانے میں اور کتنی ہی قدیم عمارات کا شاہجہاں کی دہلی اور اس کی عمارتوں میں صرف ہوا ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ نقصانات کی تلافی نئی عمارتوں نے کر دی ہے؟ مغلوں کی عمارتیں اسلامی عمارات میں افتخار کی مستحق سہی، لیکن فنی ارتقا کے لحاظ سے ترک سلاطین دہلی کی بنائی ہوئی عمارات مغلیہ عمارات کے نمونوں کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً تاریخوں کے بیانات اور نیز کچھ بچے ہوئے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ خلجی دور کی عمارتیں جنکی تعریف تیمور جیسے جہانگرد پادشاہ کو بھی کرنی پڑی۔ ہندوستان میں اس ہندو اسلامی طرز کی جسے غلطی سے لفظ پٹھان سے موسوم کیا جاتا ہے (حالانکہ نہ یہ آگانہ واقعاً یہ اصطلاح کوئی معنی یا اطلاق رکھتی ہے) بہترین نمونے تھیں۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ سیری کی ناکمل جامع مسجد، جو اخیر خلجی کے ناوقت قتل کی وجہ سے پوری ہونے سے رہ گئی تھی، شان اور خوشنمائی کے لحاظ سے دنیا میں بےمثل مسجد ہوتی۔ فیروز شاہ کی شاہی مسجد نے تیمور سے خراج تحسین لیا تھا۔ حالانکہ فیروز شاہ کے زمانہ کے آثار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعمیری فن اس کے زمانہ میں قدرے زوال پذیر ہو چکا تھا۔ غلاموں اور خلجیوں کے وقتوں کے استادوں نے اپنے

سلہ ص ۱۲۱ ص ۴۳ ترجمہ

جانشین دہلی میں بہت کم چھوڑے تھے۔ بلکہ اکثر محمد تغلق کے ہاتھوں آوارۂ وطن ہو چکے اور خصوصاً دکن میں فنون دہلی کی ترویج و آبیاری کے باعث ہوئے

دہلی کے مسلمان فاتحین اور ابتدائی حکمرانوں کو وحشی قرار دینا ایک خالص افسانوی نظریہ کا رتبہ رکھتا ہے اسلامی تمدن صدیوں سے اپنا عروج پا چکا اور ان سب قوموں کو جو اس کی گود میں آچکی تھیں پورے طور پر شائستہ بنا چکا تھا اور غوری سلاطین جو فاتح کی حیثیت رکھتے تھے علوم و فنون کے سرپرست تھے، چنانچہ مشہور عالم و حکیم امام رازی کا کچھ عرصہ تک غیاث الدین کے دربار میں قیام رہا اور یہ بادشاہ مساجد و مدارس کے تعمیرات میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔

مسلمانوں نے جب اپنی تعمیرات شروع کیں تو ناممکن تھا کہ وہ قدیم ہندو نمونوں سے آنکھیں بند کر لیتے۔ ہندوستان کا چپہ چپہ بیشمار قدیم یادگاروں سے بھرا پڑا تھا جو وضع و حسن میں اپنی آپ جواب تھیں اور آج تک دنیا کے لئے باعث ہزاراں حیرت ہیں، لیکن مسلمان ہمیشہ ان کی نقل نہیں کر سکتے تھے، اول تو خود ان میں اسلامی فنون کا بڑا نشو و نما ہو چکا تھا جن سے وہ مانوس تھے پھر بعض چیزیں مثلاً ہندوستانی مندر کا نقشہ جہاں انفرادی پرستش کو ترجیح حاصل ہے، مسجد کے نقشے کے لئے موزوں نہ ہو سکتا تھا۔ جہاں کہ اسلامی جمہوری و اجتماعی نصب العین کے باعث مجمع و جماعت ناگزیر تھے۔ نہ ہندو نمونہائی

عله ابن الاثیر ذیل وقائع ۵۹۵ و ظفر الدولہ ج ۲ ص ۶۹۰ و ما بعد، عله ظفر الدولہ ج ۲ ص ۶۸۳

آرائش ہی ان کے لئے موزوں ہو سکتے تھے جن میں جانداروں یا معبودوں کے بت مجسمے اور تصاویر عام طور سے کام میں آتے تھے۔

پھر بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدیم مسلمان تعمیر کنندوں نے ابتداً ہندوؤں کے میٹریل سے حسب موقع بغیر ترمیم یا قدرے ترمیم سے کام لیا ہے۔ اجمیر اور دہلی کی سب سے پرانی عمارتوں میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔ مسجدیں ہندو ستونوں پر قائم ہیں جنکی مورتیں مٹادی گئی یا کچھ لگا دی گئی ہیں۔ ستونوں پر چھتوں کی جو ڈاٹیں لگائی گئی ہیں وہ ہندو وضع کی ہیں اور تہ پرتہ لگا کر بنائی گئی اور اصلی ڈاٹ کے طور پر جو چھلے اور کنجی سے تیار ہوتی ہے، مرتب نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے نیچے کھڑے ہو کر دیکھنے سے عمارت کے اندرونی حصّوں کا وہی نمونہ نظر آتا ہے، جو کوہ آبو کے جینی مندروں کے اندر کھڑے ہو کر ان کے ستونوں اور چھتوں کا دکھائی دیتا ہے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ماہران فن نے اس کھلی ہوئی مشابہت کو شروع سے محسوس کر لیا تھا۔ اور اس کی پردہ پوشی اونچے طاقوں سے کرنا چاہتے تھے جنھیں اندر کی سب تعمیرات پر سربلندی بخشی گئی ہے۔ ان طاقوں کا طرز خاص اسلامی ہے، نوکیلی محرابیں، اور ان پر کوفی و نسخی کتبے اور بیل بوٹے۔ یہ سطحی آرائش فن کتابت کی پوری مہارت چاہتی تھی۔ خاصکر آرائشی کوفی جو کہ غیر معمولی طور پر مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس لیے کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان خطاطوں نے

ان کتبوں اور غالباً نقشوں کو لکھا ہوگا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً تعمیر کے وقت تجربہ کار مسلمان معماروں اور سنگتراشوں کی پوری مدد حاصل نہ تھی، اس لئے انہوں نے ان دروں کو بھی تہ پرتہ لگا کر چنا ہے اور ڈاٹ کے چھلے اور کنجی سے کام نہیں لیا۔ یہ بات کھلی ہوئی شہادت اس امر کی ہے کہ ان کے بنانے میں ہندو سنگتراشوں اور معماروں کا ہاتھ رہا ہے۔

اسی طرح قطب مینار میں بھی ہندو اسلامی طرزوں کی آمیزش کی گئی ہے، یہ ایک ایسی عمارت ہے جس میں ہندوستانی سنگتراشی کی قدیم چابکدستی نے نیا جلوہ دکھایا ہے، اسلام کی ابتدائی مینار مربع شکل کی ہوتی تھیں اور اندلس اور مغرب میں آج تک یہ نمونہ باقی ہے، اور ان کے نمونے سے یورپ کے بعض منارین نقل ہوئی ہیں۔ مشرق میں گول میناروں کے نمونے پہلے سے رائج ہو چکے تھے لیکن ستارہ نما بنیادی نقشہ اور پہلودار منارہ کا خیال یقیناً ہندوستان کے بیشمار مندروں کے نمونوں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جس کے بعض بہترین نمونے بھوانیشر اور کھجوراہہ کے مندروں میں ملتے ہیں۔ قطب مینار کے پیشرو غزنہ میں محمود و مسعود ثالث کے بنائے ہوئے مینار سے بتائے جاتے ہیں، جو ستارہ نما نقشہ پر مبنی ہیں۔ لیکن محمود کو ہندوستانی کاریگروں کی مدد حاصل تھی، اور میرے خیال میں ان ابتدائی ستارہ نما میناروں کا خیال بھی ہندوستان ہی سے لیا گیا تھا قطب مینار میں

ابھرے ہوئے کتبے اور چھجے بھی ہندوستانی طرز سے زیادہ قریب ہیں اور
جہاں تک مجھے معلوم ہے مناروں کی منزلوں میں ہر جگہ چھجّہ کا استعمال
ہمارے ہندوستان کی قدیم ترین مینار سے ماخوذ ہے۔ چھجوں کے نیچے کی
آرائشیں البتہ عربی وضع کی ہیں جن سے ہندو معمار پہلے سے واقف نہ تھے
لیکن جس کے نمونے پہلے سے اسلام کے مغربی ممالک تک ملتے ہیں۔
اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ قطب مینار کے تعمیر کے وقت مسلمانوں کو باہر
کے استاد بھی مل چکے تھے،

نوکدار طاق کا طرز بھی اسلامی ہے، ہندوستان کی بعض قدیم عمارات کی
آرائش میں نوکدار طاق ملتے ہیں جو پیپل کے پتے سے نقل کیئے گئے ہیں۔ لیکن
وہ پتھر میں ترشے ہوتے ہیں۔ ڈاٹ کی شکل میں کہیں نہیں بنائے گئے۔ یہ
ممکن ہے کہ اس طرز کا ابتدائی نکاس ہندوستان ہی کو مانا جائے۔ لیکن
جس وقت دہلی میں اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔ مسلمانوں کے لئے یہ نمونہ
نیا نہ تھا۔ جنھوں نے اس وقت تک اور بھی کئی قسم کی محرابیں ایجاد کرلی تھیں
مثلاً نعل اسپی، تیتیا، اور دندانہ دار، جن کے جمیل ترین نمونے شام واندلس
کی اُموی عمارات اور بعد کی مغربی تعمیرات میں پائی جاتی ہیں، ان محرابوں
کے آرائشی نمونے بھی تراشیدہ بعض قدیم ہندو عمارات میں ملتے ہیں۔ لیکن
اسلامی عمارات میں ان کا استعمال غالباً اسلامی ممالک سے آیا ہے۔

اس دور کے نمونوں کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فن تعمیر نے ہندوستان میں اپنا راستہ خود چھانٹ لیا تھا۔ اس ملک میں وہ اپنے طریقہ پر تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے بلا کسی پس وپیش کے طے کر لیا تھا کہ ہندو مسلم جمالی تصوّرات کو یکجا کر دیں۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانہ تک یعنی تقریباً ایک صدی کے بعد دہلی کا فن تعمیر پختہ ہو چکا تھا اور میری رائے میں اپنے انتہائی عروج کو پہونچ چکا تھا۔ علائی دور کے نمونوں کو خالص عربی نمونوں کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے، اس کا صحیح نام ہونا چاہیئے۔ ہندو اسلامی نمونہ۔ اس درمیان میں اس فن نے دونوں نمونوں کو ملا جلا کر ایک کر لیا اور نہایت حیرت انگیز طریقہ پر اُن میں موافقت پیدا کر لی ہے۔

تغلقوں کے برسر اقتدار آتے ہی ایک رَدّ عمل نظر آتا ہے۔ اور وجہ کے ساتھ سو سوا سو برس میں تمدنی معاشی اختلاط بلکہ تحلیل کے عمل سے ملک کے مسلمانوں میں ہندوستانیت بڑھتی جا رہی تھی، اور کچھ باہمی رواداری بھی۔ ابھی یہ عمل تکمیل کو نہ پہونچا تھا کہ خسرو کے غدر نے ایک طرح کی روک پیدا کر دی۔ غیاث الدین تغلق دوسرے خیالات لے کر آیا اور تغلقوں کے چند باقی ماندہ نمونوں کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ بلاشبہ خالص اسلامی اوضاع کے زیادہ دلدادہ تھے۔ ان کے باقیماندہ نمونوں میں بیرونی اثرات بالخصوص مصری نمایاں ہیں۔

اس کا اندازہ مشکل سے ہو سکتا ہے کہ محمد تغلق کے دہلی کی آبادی کو دکن میں منتقل کر دینے سے دہلی میں اعلیٰ ماہروں اور فنی مہارت میں کتنی کمی آ گئی بہر حال فیروز شاہ کے موجودہ نمونوں کو دیکھکر فنی زوال کا خیال ہوتا ہے۔ مثلاً قطب مینار کو لو۔ فیروز شاہ نے بجلی سے نقصان ہو جانے کے باعث اس کی کچھ مرمت کرائی اور اوپر کے حصوں میں ترمیم و اضافے کیے تھے۔ فیروز شاہ کے زمانہ کا حصہ (مثلاً اس کے چھجوں کے نیچے کی آرایش، پہلے حصوں سے ہر طرح پست ہے، اور اس کے جمال و تناسب میں الگ فرق پڑ گیا ہے، عیسائی تعمیر کنندوں نے ایسی ہی غلطی جامع مسجد اشبیلیہ کے ماذنہ میں کی جو اب ہاں کے گرجا کا گھنٹہ بن گیا ہے، اس زمانہ کی ایک قدیم تصویر محفوظ ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جمال و تناسب کو بھی ناسمجھ ہاتھوں سے کیسا نقصان پہونچا ہے۔ میرا یقین ہے کہ وہ اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں بمقابلہ موجودہ حالت کے بہت زیادہ موزوں اور حسین تھا۔

اسلامی تعمیرات کے تین خاص عناصر محراب، گنبد و مینار شروع سے ہی ہندوستان کے اسلامی دور میں رونما ہو گئے تھے۔ علائی دور میں فدانہ دار

---

۵ دیکھو پلیٹ ۲۲، موسیو ہنری تیراس *Henri Terrasse* کی کتاب ہسپانوی مراکشی فن پر *L'Art Hispano-Mauresque* مطبوعہ پیرس ۱۹۳۲ء)

نعل اپسی محراب کا استعمال شروع ہو گیا تھا لیکن ہندوستان میں آخر تک نوک دار محراب کو زیادہ ہر دلعزیزی و رواج حاصل رہا ہے، اور اس کے اثرات آج تک جاری ہیں۔ محراب نے مغلوں کے زمانہ میں زیادہ شوکت و زیبائش حاصل کر لی لیکن وہ سب اس کے ابتدائی نمونہ کی ترقی یافتہ شکلیں معلوم ہوتی ہیں گنبد کو اس ابتدائی دور میں وہ سر بلندی نصیب نہیں ہوئی تھی، جو قدیم رومی و بازنطینی عمارات میں پائی جاتی ہے اور خود ہندوستان میں بعد کے دور میں مغلوں کی عمارات میں موجود ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ رفعت کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا غلاموں کے زمانہ کے گنبد پست و حقیر ہیں، علائی دور میں بھی ان کی کمان بہت نیچی ہے، مگر تغلقوں کے زمانہ میں وہ کچھ اونچا اٹھتا دکھائی دیتا ہے قطب مینار نے ایک ایسا نمونہ پیش کیا تھا جس کا مقابلہ یا نقل آسان نہ تھی خلجیوں کے زمانہ میں علاؤ الدین اور قطب الدین نے اس سے فوقیت لیجانے کی ناکام کوشش کی تھی لیکن بعد کی مسجدوں میں اس کی دشواری نے اس خیال ہی کو بھلا دیا تھا، چنانچہ عام طور میں صوبوں کی مسجدوں کے صحن اس چیز سے خالی رہے ۔

آرائش میں کوفی خط کا استعمال غلاموں کے بعد بہت کم ہو گیا اور اس کی جگہ نسخ وغیرہ نے لے لی تھی۔ مغلوں کی حملہ آوری کے بعد کوفی خط کا عام زوال ہو گیا تھا۔ کوفی خط کے قطب، سلطان غازی اور مسجد

اجمیر کے کتبے خاص وقعت کے مستحق ہیں جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ بغداد کی خلافت اور اس کے ساتھ اس کا صدیوں کا تمدن مغلوں کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا، اور یہ اپنے فن مٹتے جا رہے تھے، جن کا احیا پھر سے ہونا ممکن نہ تھا۔

مسلمانوں سے پہلے سرزمین دہلی کی تاریخ زیادہ تر تاریکی میں چھپی ہوئی ہے۔ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ سب سے پرانا شہر جو یہاں پر بسا اندرپرست تھا۔ جس کا ذکر مہابھارت میں موجود ہے اور زمین کے نیچے گپتوں کے زمانہ کے کچھ آثار بھی ملے ہیں، لیکن عہد وسطی میں اسکی حیثیت محض ایک معمولی موضع کی رہ گئی تھی جس کا ذکر مسلمان مصنفوں کی کتابوں میں اندپت کے نام سے ملتا ہے۔ فیروز شاہ کے عہد میں وہ ایک قصبہ تھا۔ لیکن فیروز آباد کے آباد ہونے پر اس کی تمام زمین نئے شہر میں شامل ہو گئی، اور بالآخر اُسی موقع پر شیر شاہ کا کوٹلہ تعمیر ہوا، جس کے کھنڈر اور خوشنما مسجد اب تک باقی ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ خاص دہلی کا موقع اندرپرستھ کے موقع سے علیحدہ اور دور تھا، اور دونوں کا محل وقوع ایک ہی قرار دینا ناممکن ہے۔

سنسکرت کے ایک کتبہ میں، جو موضع پالم میں لگا ہوا تھا، اور جس میں سمت ۱۳۳۷ مطابق ۱۲۸۰/۱۲۸۱ سنہ درج ہے۔ یہ نام ڈھلی ढिल्ली ہی لکھا ہوا پایا جاتا ہے [1]

---

[1] دیکھو Epigraphica Indomuslimica

لوہے کی لاٹ پُرانی دہلی کی سب سے قدیم یادگار ہے، اور اگر موجودہ جگہ پر وہ بعد میں بھی نصب کی گئی ہو۔ جیسا کہ کھدائی کے نشانوں سے ماہرین آثار کا خیال ہے، تو بھی یہ قیاس کہ وہ کسی دوسرے باہر کے مقام سے لائی گئی ہے۔ صحیح نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اغلب یہی ہے کہ وہ اسی موضع سے تعلق رکھتی، اور عجب نہیں کہ پُرانے ہندو مندر میں بطور قدیم یادگار کے پہلے سے نصب تھی یہ البتہ ممکن ہے کہ مسلمانوں نے اسے ایک نادر چیز سمجھکر صحن مسجد میں اسی کے موجودہ موقع پر کھڑا کر دیا ہو۔

بہر حال قدیم ترین رسم الخط اور گھنٹے کی شکل کے سرسے اُسے گپتوں کے زمانہ کا سمجھا جاتا ہے اور اس میں ایک نامدار راجہ چندر کا ذکر ہے جس کا زمانۂ حیات چوتھی صدی عیسوی قرار دیا جاتا ہے لیکن اس نام کا کسی تاریخی شخصیت سے یقینی مطابقت دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس کتبے میں دہلی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ وشنو کا اونچا نشان وشنو پدی کی پہاڑی پر نصب ہوا تھا۔

اسی موقع پر اُسے مغربی سیاح ابن بطوطہ نے دیکھا تھا، جو لکھتا ہے،

"مسجد کے وسط میں ایک لاٹ ہے معلوم نہیں کس دھات کا، کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ ہفت جوش یعنی سات دھاتوں کو جوش دیکر بنایا ہے، کسی نے اس لاٹ میں سے ایک انگل بھر ٹکڑا اتراشا ہے، وہ جگہ نہایت چکنی ہے

و بااس پر اثر نہیں کرتا ۔ اس کا طول تیس ہاتھ ہے اور دور آٹھ ہاتھ جو میں نے پگڑی سے ناپے تھے[1]

کیمیائی تحلیل سے معلوم ہوا ہے کہ وہ فی الواقعہ لوہے سے بنی ہوئی ہے، مگر اس لوہے میں یہ خصوصیت ہے کہ زنگ نہیں کھاتا ۔

اسی لاٹ پر خاص دہلی کے متعلق سب سے قیمتی کتبہ حسب ذیل ہے ۔

"سموت دہلی ۱۱۰۹ اننگ پال بہی"

جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس سمت میں جو عیسوی حساب سے ۱۰۵۲ء اور ہجری حساب سے ۴۴۳ھ کے مطابق ہے ۔ اننگ پال نے دہلی کو بسایا تھا ۔ یہ تومار نسل کا راجہ تھا ۔ جس کے جانشین چوہان ہوئے تھے ۔ جن کا آخری تاجدار پرتھوی راج تھا ۔

دوسرے تاریخی شواہد و قرائن پر غور کرنے سے بھی یقین ہوتا ہے کہ خاص دہلی گیارہویں صدی عیسوی و پانچویں صدی ہجری کے اواسط میں آباد ہوئی تھی اور محمود و مسعود کے زمانہ میں وہ کسی معروف مقام کی حیثیت نہیں رکھتی تھی چنانچہ علامہ الدہر ابوریحان البیرونی نے اس کا ذکر نہ کتاب الہند میں کیا ہے ۔ جس میں ہندوستان کے معروف مقامات کا تذکرہ موجود ہے Kanauj ، اور

---

[1] ۔ ص ۲۰ متن ص ۴۲ ترجمہ ۔

نہیات کی کتاب قانون مسعودی میں، جس میں ہندوستان کے مشہور مقامات کے طول البلد و عرض البلد درج ہیں۔

سب سے پہلا تذکرہ جو مجھے اپنے مطالعہ کے دوران میں دستیاب ہوا ہے۔ ناصر خسرو کے سفرنامہ ۴۲۶ھ میں ہے، لیکن وہ خالی از شبہ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ سیاح مصر کے تذکرہ میں لکھتا ہے:-

"دگروہے ملکزادگان و پادشاہزادگان اطراف عالم بودند کہ اینجا رفتہ بودند

از مغرب و یمن و روم و سقلاب و نوبہ و حبشہ و ابنائے خسرو دہلی (ص ۶۷)"

لوہے کی لاٹ کے سمت ۱۱۰۹ کے کتبہ کے بعد دوسری تحریری سند قطب مسجد کے ایک ستون کا وہ کتبہ ہے جس پر سمت ۱۱۲۴ درج ہے جو بکرمی حساب سے ۱۰۶۷ء کے مطابق ہوتا، اور اننگ پال دوم کے زمانہ کا بتایا جاتا ہے جو سلطان ابراہیم غزنوی کا معاصر تھا۔ یہ دہلی کے تختگاہ اعظم کی تاریخ تعمیر معلوم ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیرونی مدافعت کے خیال سے ہندوؤں نے جمنا کے دونوں طرف مضبوط قلعوں کا دوہرا سلسلہ قائم کرلیا تھا جس میں اس طرف دہلی پانی پت، کیتھل و سُنام وغیرہ تھے اور ادھر میرٹھ برن اور رکول وغیرہ۔ امیر خسرو نے نُہ سپہر میں لکھا ہے کہ دہلی میں اننگ پال کا ایک محل موجود تھا۔ جس کے دروازہ پر شیر بنے تھے اور زنجیر عدل لگی تھی۔ جسے کھینچ کر مظلوم راجہ سے

فریادی ہوتے تھے۔

غوریوں کے حملوں کے وقت دہلی دارالسلطنت کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ وہاں پرتھوی راج کا بھائی گووند راؤ[1] حاکم تھا۔ چوہانوں کا دارالسلطنت اجمیر میں تھا، لیکن جیساکہ تاج المآثر میں لکھا ہے اور بعد میں ابن بطوطہ کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، دہلی کا قلعہ اونچائی اور مضبوطی میں ہفت اقلیم میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا[2]۔

۵۸۸ھ میں مسلمانوں نے پہلی مرتبہ اس کا محاصرہ کیا تھا لیکن اسوقت مصالحت سے ہندوؤں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا تھا لیکن اگلے برس مسلمانوں نے اس پر قبضہ کر کے اپنا دارالسلطنت بنا لیا[3]

کتبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح کے بعد ہی نئی تعمیرات کا کام جلد شروع ہو گیا تھا۔ جو ان دو سو برس میں برابر جاری رہا۔

جامع مسجد غالباً سب سے پہلی عمارت تھی جس کی بنیاد ایبک نے ہی ڈالدی تھی، جیساکہ شرقی دروازہ کے کتبہ میں کندہ ہے:۔

---

[1] ظفرالدولہ ص ۸۰۷، حضر المدیدہ اخوہ الرائے گووند صاحب دہلی ومبارکشاہی ص ۸، گوبند رائے ضابطہ دہلی برادر پتھورا رائے۔ [2] ص ۱۹ اتن "والسور المحیط لمدینۃ دہلی لا یوجد لہ نظیر"۔

[3] تاج المآثر، ومبارکشاہی ص ۱۱۔

این مسجد را بنیاد کرد قطب الدین ایبک خدا بر آں بندہ رحمت کنا دہر کہ
بانی این خیر را دعائے ایماں گوید"

اسی دروازہ پر جو دوسرا کتبہ لگا ہوا ہے جس میں فتح کی تاریخ ۵۸۷ھ درج ہے اور جسے بھول سے ابن بطوطہ نے ۵۸۴ھ بیان کیا ہے[۱] وہ بعد میں پہلے کتبہ کی توضیح کے لئے لگایا گیا ہے۔ یہ کہنا البتہ مشکل ہے کہ کب، اگر ایبک کے زمانہ میں، تو یہ کتابت یا کھدائی کی غلطی ہو گی اور اگر ایل تمش کے زمانہ میں جو اغلب ہے، تو یاد داشت کی غلطی ہے، دروازۂ شمالی کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۹۲ھ میں مسجد ہنوز زیر تعمیر تھی اور اسے جاری رکھنے کا حکم محمد غوری نے دیا تھا۔ بڑے در کے بازو پر ذی قعدہ ۵۹۴ھ کندہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے در اور غالباً عمارت بھی ۵۹۴ھ میں مکمل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد فوراً ہی منارہ کا کام شروع ہوا

خوش قسمتی سے قطب مینار کی تاریخ اس کے کتبوں میں محفوظ ہے۔ سنسکرت کے دو کتبوں میں جو نیچے کی منزل میں دروازہ کے دونوں طرف معماروں نے کھو دیئے ہیں سمت ۱۲۵۶ لکھا ہوا ہے۔ جو ۱۱۹۹ء و ۵۹۶ھ کے مطابق ہوتا ہے۔ ابتدائی منزل کے کتبوں میں غیاث الدین اور اس کے بھائی

---

[۱] ص ۱۹ متن ص ۳۹ ترجمہ۔

معز الدین محمد بن سام فاتح ہند اور سپہ سالار آئے بک کے نام کے کتبے ملتے ہیں جن سے کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ اس ابتدائی منزل کی بناء تعمیر کے وقت تینوں حیات تھے۔ ترتیب میں علی قدر مراتب سب سے اونچا غیاث الدین کا نام ہے۔ اس کے بعد معز الدین کا، اور سب سے نیچے ایبک کا۔

اس میں کوئی شک اور کلام نہیں ہو سکتا کہ یہ منارہ ماذنہ کے طور پر بنایا گیا تھا۔ چنانچہ اذان کی آیت "واذا نودی للصلوٰۃ الخ" دوسری منزل کے دوسرے کتبہ میں کندہ ہے۔ ابو الفدا نے اُسے ماذنہ ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔

اور امیر خسرو اس کی تعریف میں قرآن السعدین میں لکھتے ہیں

قامت خود کردہ موذن دراز — دادہ اقامت بہ اذان نماز

گردسرش گرد موذن چو گشت — قامتش از مسجد علیٰ گذشت

موذنش آنجا کہ اقامت کشید — قامت موذن نتواند رسید

(ص ۳۰ - ۳۱)

دوسری تیسری اور چوتھی منزلوں میں التمش کے نام کے کتبے لگے ہوئے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ بقیہ درجوں کی تکمیل اسی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ پھر کوئی ترمیم و اضافہ فیروز شاہ کے وقت تک نہیں ہوا۔ ابو الفدا نے لکھا ہے کہ اصلی حالت میں اس میں ۳۶۰ سیڑھیاں تھیں یعنی موجودہ تعداد سے ۱۹ کم منارہ کو اسی اصلی حالت میں یعنی فیروز شاہ سے پہلے ابن بطوطہ

نے دیکھا تھا جس کا بیان اس بارہ میں خاص وقعت رکھتا ہے۔

مسجد کے شمال میں ایک صومعہ ہے جس کی نظیر اسلام کے کسی ملک میں نہیں پائی جاتی۔ یہ مینارہ سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے، حالانکہ مسجد سفید پتھر کی ہے، مناروں کے پتھروں پر نقش کندہ ہیں اور اس کے اوپر کا چھتر خاص سنگ مرمر کا ہے اور لٹو زر خالص کے، اندر سے اس کا زینہ اس قدر چوڑا ہے کہ اس پر ہاتھی چڑھ جاتا ہے۔[1]

اس بات کی تصدیق کہ مینارہ میں سونے کے لٹو لگے تھے، امیر خسرو کے بیان سے بھی ہوتی ہے، جنہوں نے اس کا تذکرہ قرآن السعدین میں ابن بطوطہ سے بہت پہلے کیا ہے۔

زانکہ ز زر بر سرش افسر شدہ است | سنگ نزدیکی خور زر شدہ است
سنگ وی از لبس کہ بخورشید سود | زور زر خور شید عیاری نمود

(ص ۳۱)

دنیائے اسلام کے دو اور بلند ترین ماذنے بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی موحد سلطان بربر یعقوب المنصور کا ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں بنوایا ہوا جامع اشبیلیہ کا جو بحالت موجودہ ۲۰۰ فٹ اونچا ہے، اور مسجد کتبیہ کا جو ۲۵۰ فٹ

---

[1] ۲ متن ص ۴۳ ترجمہ

اونچا ہے۔ قطب مینار کی بلندی بحالتِ موجودہ ان دونوں سے کم ہے یعنی ۲۳۸ فٹ، لیکن اصلی حالت میں بھی، چھتری وغیرہ کو شامل کرکے اس سے کچھ بہت کم نہ ہوگی۔

آئے بک کے زمانہ میں مسجد و منارہ کا متولّی یعنی مہتمم فضل بن ابوالمعالی تھا جس کے نام کے کتبے دونوں عمارتوں میں موجود ہیں مسجد کے ایک ستون پر لکھا ہے۔

"فی تولیۃ العبد فضل بن ابی المعالی"

اور دروازہ منارہ کے سمت راست میں کندہ ہے "ایں منارہ فضل ابوالمعالی بود"۔

تیسری منزل پر ایک جگہ کندہ ہے۔

ھذا العمارۃ فی نوبتہ العبد المذنب محمد امیر کوہ

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ التمش کے زمانہ میں مہتمم تعمیرات دوسرا شخص تھا۔

اس مادنہ میں جا بجا کچھ ہندی کتبے بھی کھدے ہوتے ملتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو معماروں نے کام کیا تھا۔ جن میں سے کچھ کے نام بھی محفوظ ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین کے زمانہ میں اس میں کچھ مرمت ہوئی تھی سمت ۱۳۸۴ (۱۳۲۸ء) میں محمد تغلق کے

شروع زمانہ میں بجلی کا خلل ہو گیا تھا۔ سمت ۱۳۸۹ (۱۳۴۳ء) میں کچھ مرمت ہوئی اور پھر سمت ۱۴۲۵ (۱۳۶۹ء مطابق ۷۷۰ھ) میں فیروز شاہ کے زمانہ میں بجلی کے نقصان انداز ہونے پر دوبارہ مرمت ہوئی، دروازہ کے کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۰۹ھ میں سکندر شاہ لودی کے زمانہ میں تیسری مرمت ہوئی تھی اور سمت ۱۵۹۹ (۹۴۹/۹۵۰ھ ۱۳۴۲ء) میں بزمانہ سکندر شاہ بھی۔

موجودہ حالت میں اُس میں فیروز شاہ کی ترمیم و اضافہ کے سواء انیسویں صدی کے شروع میں میجر اسمتھ کے چھجوں کے اوپر کنگروں کی بجائے کٹہرے لگا دینے اور زیر کتبوں کو مرمت کے وقت صحیح اور اصلی موقعوں پر نصب نہ کر سکنے، اور اوپر کی منزل میں قبہ کے دور ہو جانے اور نیچے کے دروازہ کی قدیم وضع کی بجائے نئی وضع کا دروازہ لگا دینے کی وجہ سے منارہ کے اصلی حسن و جمال ہیئت و تناسب اور تاریخی اندراجات میں فرق پڑ گیا ہے، ورنہ اُسے جس حالت میں اس کے استادوں نے چھوڑا تھا وہ پانچ درجوں پر مبنی اور جمال و تناسب میں نکتہ چینی سے بالاتر تھا۔

مشرقی دروازہ کے دوسرے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد ایک میں بقدر ۵ کرور چالیس لاکھ دنیوال کے صرف ہوا تھا، جو بقدر دس لاکھ روپیہ کے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اتنا ہی روپیہ شاہجہاں کی جامع مسجد دہلی

میں صرف ہوا ہے لیکن کل مسجد پر جس میں بعد کے ایل تتمش اور علاؤالدین کے حصوں کو جن کا ذکر آگے آئے گا شامل کر کے تقریباً اس کا دس گنا یعنی بقدر ایک کروڑ روپیہ کے صرف ہو گیا ہوگا، جو جامع مسجد قرطبہ کے بعد جس پر ڈیڑھ کروڑ صرف ہونا بتایا جاتا ہے، غالباً دنیا کی کسی مسجد پر صرف نہیں ہوا ہوگا۔

ایل تتمش نے اصلی مسجد کے شمالی و جنوبی سمت میں تین تین دروں کے اضافہ سے مسجد کی توسیع کر دی تھی جس کی تکمیل کی تاریخ جنوبی طرف بڑے در کے پایہ پر ۶۲۷ھ درج ہے۔

ان اضافوں کے بعد مسجد کی لمبائی شمالاً جنوباً پونے چار سو فٹ اور چوڑائی بقدر پونے تین سو فٹ تھی۔ جو بلحاظ رقبہ اندلس کی مسقف مسجد اموی قرطبہ کے نصف سے کم اور قیروان کی مسقف مسجد سے کچھ زیادہ ہے۔

اس مسجد کی ترتیب اسی وضع پر ہے جو کہ قدیم عباسی مسجد سامرّہ میں پائی جاتی ہے، یعنی چاروں طرف مسقف رقبہ اور بیچ میں کشادہ صحن۔ اس نمونہ کا اتباع مصر کی مسجد ابن طولون میں بھی کیا گیا تھا۔ جس کا طول ۵۳۰ فٹ ہے، اور اسی قدر عرض۔

ابن بطوطہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانہ میں بارہ قبّے تھے لیکن امیر خسرو نے قرآن القدس میں جو اخیر علائی سلطان کیقباد

کے وقت میں تصنیف ہوا ہے لکھا ہے کہ ۹ قبے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے
کہ بقیہ تین قبے علائی دور میں اضافہ ہوئے تھے۔

غلغل تسبیح بگنبد دروں   رفتہ زنہ گنبد والا بروں

(ص ۳۰)

مسٹر پیج سپرنٹنڈنٹ آثار قدیمہ نے قطب پر ایک قیمتی مقالہ لکھ کر شائع کرایا ہے[1] جس کے ساتھ اس مسجد کی ایک قیاسی شکل بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں مسجد کے در اوپر سے سادہ دکھائے گئے ہیں، لیکن فوائد الفواد کے ایک مقام سے مستنبط ہوتا ہے کہ ان دروں پر کنگرے بنے تھے[2] اور درمیانی دروں میں سنہرے تھے اور غالباً دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے منارے تھے۔ جیسا کہ اجمیر کی مسجد کے درمیانی در پر اس وقت تک موجود ہیں۔

مسجد و ماذنہ کے علاوہ جو غلاموں کے زمانہ کی تعمیرات ہیں ان کی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ متعدد شاہی قصر بھی ان کے زمانہ میں تعمیر ہوئے تھے جن میں سب سے قدیم دولت خانہ تھا، جس کی بنیاد بظاہر ایبک کے زمانہ

---

[1] دیکھو پلیٹ ۱۱ *Memoir of the Arch; Survey of India*

[2] سحر گاہے بزرگے را دیدم کہ بر بالائے کنگرہائے بام مسجد آدینہ کہ بر سر طاق محرابے است نی آید ص ۱۲

میں مسجد و ماذنہ کے ساتھ یا قریبی وقت میں پڑھ چکی تھی، اور ایل تمش کی تخت نشینی اسی میں ہوئی تھی اور بعد میں یمن کے طور پر سلاطین دہلی کی رسم تاجپوشی محمد تغلق کے وقت تک اس میں ہوتی رہی۔

اس عمارت کا ذکر قدیم تواریخ اور ابن بطوطہ نے کیا ہے۔ لیکن موجودہ تواریخ اس کے تذکرے سے خالی ہیں، اس کی جانب سب سے پہلے راقم آثم نے ایک مقالہ لکھ کر توجہ دلائی تھی[1]۔ یہ عمارت عرصہ دراز تک محفوظ رہی۔ اس کا سب سے آخیر حوالہ سنہ ۸۳۰ھ میں تاریخ مبارکشاہ میں ملتا ہے[2]۔ ہماری زبان میں دولت خانہ کے اعزازی کلمہ کا ماخذ اسی عمارت کے نام سے معلوم ہوتا ہے۔

دیگر محلات کے نام قصر سفید، کوشک فیروزی و قصر سبز ہیں۔ ایبک سے لے کر معز الدین بہرام شاہ یعنی سنہ ۶۳۹ھ تک قصر سفید قصر سلطنت رہا۔ پھر علاؤالدین و ناصرالدین کے دربار قصر فیروزی میں ہوتے رہے غالباً ناصرالدین کے زمانہ میں قصر سبز تعمیر ہوا تھا، جہاں مغل ایلچی کا استقبال ہوا تھا[3]۔ برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قصر بداؤں دروازہ کے سامنے تھا اور ابن بطوطہ نے لکھا ہے" کوشک فیروزی جامع مسجد کے قریب تھا[4]

---

[1] ساقی۔ [2] ص ۲۴۱، [3] طبقات ناصری میں ان تمام قصروں کا ذکر ہے ص ۳۰۹، [4] ص ۵۴ ترجمہ میں ص ۲۵ متن۔

ان سب میں زیادہ مشہور قصر لعل تھا، جسے بلبن نے اپنے خانی و نیابت کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا۔ اور جو اسکی تخت نشینی کے بعد قصر سلطنت قرار پایا تھا۔ اس قصر کا بہترین چشمدید حال ابن بطوطہ نے لکھا ہے لیکن غلطی سے اس عمارت کو جلال الدین کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے۔

سلطان جلال الدین کا محل کوشک لعل کے نام سے مشہور اور شہر دہلی کے اندر ہے۔ یہ محل بہت بڑا ہے، اس میں ایک بہت بڑا صحن ہے، اس کی دہلیز بہت بڑی جس پر ایک بُرج ہے۔ جس کے اندر اور باہر دونوں صحن نظر آتے ہیں۔ سلطان جلال الدین اس بُرج میں بیٹھکر اندر کے صحن میں جب چوگان بازی ہوتی دیکھا کرتا تھا۔ جب امیر سیف الدین کو اس محل میں ٹھہرایا گیا تو میں نے یہ حال دیکھا تھا۔ تمام اسباب سے بھرا ہوا تھا، لیکن تمام چیزیں بوسیدہ ہوگئی تھیں، ہندوستان میں دستور ہے کہ جب بادشاہ مرجاتا ہے تو اس کے محل کو چھوڑ دیتے ہیں اور نیا بادشاہ اپنے لئے علیحدہ محل تیار کراتا ہے اور اس کے محل کی کوئی چیز اس جگہ سے نہیں ہلاتے، میں اس محل میں اچھی طرح پھرا اور اس کی چھت پر بھی گیا۔ عبرت کا مقام تھا۔ میرے آنسو نکل پڑے فقیہ جلال الدین مغربی، غرناطی نے جو بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے اور اس وقت میرے ساتھ تھے یہ شعر پڑھا۔

وسلاطینہم سل الطین عنہم — فالرؤس العظام صارت عظاما

ان کے بادشاہوں کا حال مٹی سے پوچھ — کہ بڑے بڑے سروں کی ہڈیاں ہو کر رہ گئی ہیں۔

فتح سے ایک صدی بعد دہلی کا جو حال امیر خسرو نے قرآن القدس میں لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت خاص دہلی میں تین حصار تھے جس میں سے ایک نیا حصار کہلاتا اور غالباً مسلمانوں کا تعمیر کیا ہوا تھا۔ اس کا حوالہ طبقات ناصری میں بھی ملتا ہے، جس میں ایک مقام پر لکھا ہے۔

" یک فوج بطرف حصار نو بدر مسجد جامع از طرف شمال درآمدند"

دفوج دوم ازمیاں بازار بزاز اسے بدر مدرسہ معزیے بطن آنکہ ایں مسجد جامع است درآمدند"

امیر خسرو لکھتے ہیں :-

از سہ حصار بش دو جہاں یک مقام — وز دو جہاں یک نفسش وہ سلام

حصن بر و نیش ز عالم برون — عالم بر ونش حصن اندرون

گفتہ حصار نو او را سپہر — کائے فلک نو بکہن دار مہر

(ص ۲۸)

ہمارے زمانے میں غلاموں کے عہد کی یادگاروں میں علاوہ مذکورہ مسجد کے دو خاص عمارتیں اور ایسی ہیں جو مدرسے تعلق رکھتی ہیں، یعنی ملک پور میں سلطان غازی کا مقبرہ، جس میں ایل تتمش کا بڑا بیٹا ناصر الدین حاکم بنگال متوفی سنہ ۶۲۶ھ

دفن ہے اور جس کی تاریخ تعمیر کا کتبہ ۶۲۹ھ کا دروازہ پر لگا ہوا ہے
مسجد وادٔنہ کے بعد قدیم ترین عمارت اس دور کی ہے۔ بیچ صحن میں چبوترہ
پر گنبد تھا۔ جو ضائع ہو گیا ہے۔ نیچے تہ خانہ ستونوں کے ساتھ بنا ہوا ہے
جس پر اوپر کا چبوترہ قائم ہے، اور اسی تہ خانہ کی وجہ سے یہ مقبرہ سلطان
غاری کہلاتا ہے۔ سلطان ایل تمش کا مقبرہ یقینی طور پر اس کے نام سے غلط
منسوب ہو گیا ہے۔ فیروز شاہ نے مرمتوں کے تذکرہ میں جو حال اس مقبرہ
کا لکھا ہے اس کے پڑھنے کے بعد کوئی شبہ نہیں رہتا کہ اصلی مقبرہ کی وضع
سلطان غاری کے مقبرہ سے ملتی تھی۔ اپنی ممتاز صنعت و آرائش کے لحاظ
سے موجودہ مقبرہ بلا شبہ مسجد وادٔنہ کے زمانہ سے قریبی تعلق رکھتا اور یقینی
طور پر خلجی دور سے پہلے کا ہے، لیکن موجودہ معلومات کی بنا پر یقین سے اس
کا تعین کہ وہ کس شخص کا ہے اور کس سنہ میں تعمیر ہوا تھا، ناممکن ہے۔

یہی مشتبہ حال رضیہ کی قبر کا ہے، جو محلہ بلبلی خانہ میں شاہجہاں آباد
میں واقع ہے۔ ابن بطوطہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی قبر دہلی
سے صرف ایک کوس پر جمنا کے کنارے تھی،[1] لیکن شمس سراج عفیف نے

---

[1] ابن بطوطہ ص ۲۶ متن۔ "وبنی علیها قبة وقبرها الآن یزار ویتبرک به وهو علی شاطی النهر الکبیر المعروف
بنهر الجون علی مسافة فرسخ واحد من المدینة (دہلی)"۔

تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ ملکہ رضیہ کے روضہ کا رقبہ فیروز آباد میں شامل تھا۔[۱] دہلی سے باہر بلبن کے مقبرہ کے لئے بھی سوائے زبانی روایت کے کوئی سند موجود نہیں ہے اور اس کے کھنڈروں کے متعلق یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ اس مقبرہ کا حال ابن بطوطہ نے لکھا ہے۔

"بلبن نے ایک مکان بنوایا تھا، اس کا نام دارالامن رکھا تھا۔ جو مقروض اس میں داخل ہو جاتا تھا۔ اس کا قرضہ ادا کر دیتا تھا۔ اور جو شخص کسی کو قتل کر کے یا کوئی اور جرم کر کے اس میں پناہ لیتا تھا، تو مقتول یا مظلوم کے وارثوں کو وہ معاوضہ دے کر راضی کر دیتا تھا اس بادشاہ کی قبر بھی اسی مکان میں بنائی گئی ہے۔ میں نے اس کی قبر دیکھی ہے۔"[۲]

پہلے سو برس تک مسلمانوں نے اپنا دارالسلطنت دہلی خاص کو رکھا۔ اور اس کو بڑھاتے رہے سب سے پہلے بلبن کے نوجوان اور رنگیلے جانشین کیقباد کو دہلی چھوڑ کر جمنا کے کنارے موضع کیلوکھری میں جہاں اب ہمایوں کا مقبرہ ہے ایک نیا محل بنانے کا خیال پیدا ہوا لیکن یہ تبدیلی اس کے اور خاندان غلاماں کی تباہی کا موجب ثابت ہوئی۔ اس کے جانشین جلال الدین خلجی نے محل کی تکمیل کر کے نئے دارالسلطنت کی بنیاد ڈالی جس میں نیا حصار اور نئی جامع مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اسی حصار کی تعریف میں امیر خسرو

---

[۱] ص ۳۴، ۱ور زین مقبرہ سلطان رضیہ۔ [۲] جلد ۲ ص ۲۷ متن ص ۵۷ ترجمہ۔

نے لکھا تھا۔

شہا در شہر نو کردی حصارے   کہ رفت از کنگرا و تا قمر سنگ

مورخ ضیائے برنی لکھتا ہے کہ ان اسی برس میں شہر دہلی کی مخلوق ترکوں کی پروردہ تھی۔ اور انھیں خلجیوں کی بادشاہی ناگوار تھی اس لئے سلطان جلال الدین دہلی میں نہیں گیا۔ اور مخلوق شہر کے تمام سربرآوردہ اشخاص کہ اس زمانہ میں ان سے شہر دہلی بھرا پڑا تھا گروہ در گروہ کیلوکھری جاتے تھے۔ جلال الدین نے کیلوکھری میں دارالملک بنا لیا اور حکم دیا کہ قصر کیلوکھری کو جس کی سلطان معز الدین نے بنا ڈالی تھی پورا کر کے نقوش سے آراستہ کریں۔ سلطان کے حکم سے تمام سربرآوردہ لوگوں نے کیلوکھری میں مکان بنا لئے اور بڑی بڑی عمارتیں بن گئیں اور بعض بازاری بھی شہر سے چلے آئے اور کیلوکھری کے بازار آباد ہو گئے۔ کیلوکھری کا نام شہر نو رکھا گیا ایک نہایت رفیع حصار پتھر سے وہاں بن گیا اور بہ جہائے بلند اور عمارت کے حصے تقسیم ہو گئے اگرچہ لوگوں کو وہاں مکانات بنانا دل سے پسند نہ تھا۔ لیکن سلطان کی سکونت کی وجہ سے جلد مکانات کھڑے ہو گئے، اور بازار بھر گئے[1] سیر الاولیا کے ایک مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی مسجد نہایت وسیع تھی اور قریب ترین ہونے کی وجہ سے سلطان المشائخ اسی میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ علاؤالدین کے زمانہ میں اس شہر میں

---

[1] ص ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۳۶

علیحدہ کوتوال رہتا۔ اور جداگانہ خزانہ تھا[۱]۔

علاؤالدین خلجی اپنے وقت کا دوسرا اسکندر تھا۔ ہر کام میں اس کا حوصلہ سب سے بڑھ چڑھ کر پایا جاتا ہے۔ ابتداً اس کا قصر سلطنت کوشک لعل رہا[۲]۔ دہلی کی قدیم جامع مسجد میں ایک شرقی صحن اور جنوب میں ایبک وایل تمش اور اپنے اضافہ کئے ہوئے رقبوں کی برابر ایک رقبہ لے کر چوتھے صحن وعمارات کا اضافہ کیا تھا جس سے مسجد کا حجم بہت بڑا ہو گیا تھا[۳]۔ تمام مسقف وغیر مسقف رقبوں کو شامل کر کے علاؤالدین کے زمانہ میں یہ مسجد دنیا کی سب سے بڑی مسجد تھی جس کا طول وعرض ۷۳۶×۴۹۴ فٹ تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی مسقف مسجد قرطبہ کی ہے جس کا رقبہ ۶۲۰×۴۷۰ فٹ ہے۔ علاؤالدین نے قطب مینار کے جواب میں دونی اونچائی کا ماذنہ بھی وسط صحن میں بنانا چاہا تھا[۴]۔ ماہرین آثار کا یہ خیال کہ وہ اس ماذنہ کو اسی حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ جیساکہ وہ اب اسی فٹ اونچا چونے کا ڈھم کھڑا ہے، غلط ہے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اس کا تہائی حصہ مکمل ہو چکا تھا جسکی اونچائی قطب مینار کے برابر تھی[۵]۔ واقعی اگر اس ماذنہ کے تمام درجے

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۸۰۔ [۲] فیروز شاہی ص ۲۴۶۔ [۳] خزائن الفتوح ص ۲۶-۲۸۔ [۴] خزائن الفتوح۔ [۵] متن ص ۲۱ ترجمہ ص ۴۳۔

بن جاتے تو دنیا کا کوئی منارہ و ماذنہ اس کا مقابلہ نہ کرسکتا۔ اس کی اونچائی پانچسو فٹ ہوتی بابر کے وقت تک یہ ماذنہ اپنی اصلی حالت میں محفوظ رہا۔ اور اس نے تزک میں اس کی تعریف لکھی ہے۔ بعد کے زمانہ میں اس مسجد و ماذنہ کے پتھر اکھاڑ دیئے گئے۔ حالانکہ جسامت و حسن و خوبی میں وہ ایک التمش کے بنائے ہوئے حصوں سے ضرور فائق تھے، ماذنہ کی تعمیر قطب الدین خلجی کے وقت تک جاری رہی تھی۔ یعنی اتنے حصے کے بننے میں ہی تخمیناً دس برس صرف ہو چکے تھے ابن بطوطہ لکھتا ہے۔

اور قطب الدین خلجی نے ارادہ کیا تھا، کہ غربی صحن میں ایک اور مینار بنا دے جو اس مینار سے بہت بڑا اور اونچا ہو اور ایک تہائی کے قریب اس نے بنوایا تھا کہ وہ مارا گیا، اور سلطان محمد تغلق نے اسے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر فال بد سمجھ کر اپنے ارادہ سے باز رہا ورنہ یہ مینار دنیا کے عجائبات میں سے ہوتا وہ اندر سے اتنا چوڑا ہے کہ تین ہاتھی برابر اس پر سے چڑھ سکتے ہیں اور یہ تہائی اس قدر بلند ہے جس قدر کہ صحن شمالی کا کل مینار ہیں ایک دفعہ اس پر چڑھا تھا تو میں نے دیکھا کہ شہر کے اونچے اونچے گھر اور فصیل باوجود بلندی کے چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے تھے اور اس کی جڑ میں کھڑے ہوئے آدمی چھوٹے چھوٹے بچے معلوم ہوتے

سکتے۔ نیچے سے کھڑے ہو کر دیکھنے سے یہ نامکمل مینار بہ نسبت پھیلاؤ اور وسعت کے کم اونچا معلوم ہوتا ہے"[1]

علاؤالدین کے بعد اس مسجد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ محمد تغلق کے زمانہ میں اس مسجد کو ابن بطوطہ نے دیکھا تھا اور وہ لکھتا ہے۔

شہر کی جامع مسجد بڑی وسیع ہے اس کی دیواریں اور چھتیں ہر چیز تراشی ہوئی سفید پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ جسکو سیسہ لگا کر جوڑ لگایا ہے۔ لکڑی کا اس میں نام نہیں۔ مسجد میں تیرہ گنبد ہیں جو پتھر کے ہیں اور ممبر بھی پتھر کا ہے، چار صحن ہیں"[2]

علاؤالدین نے اپنے زمانہ میں خاص دہلی کے حصاروں کی مرمت و درستی کرائی تھی۔ ابن بطوطہ نے حصار دہلی کی تعریف اس طرح لکھی ہے

"شہر کی فصیل تمام دنیا میں بے نظیر ہے۔ اس کا عرض گیارہ ہاتھ کا ہے، اس میں کوٹھریاں اور مکانات بنے ہوئے ہیں۔ جس میں چوکیدار اور دروازوں کے محافظ رہتے ہیں اور غلہ کے کھتے جنہیں انبار کہتے ہیں بنے ہوئے ہیں منجنیق اور لڑائی کے سامان بھی انہیں گوداموں میں بھرے ہوئے ہیں۔ غلہ بھی ان ہی میں جمع کرتے ہیں۔ وہ ہر ایک آفت سے محفوظ رہتا ہے، اور رنگ بھی نہیں بدلتا۔ میرے سامنے ان گوداموں میں سے چاول نکالے گئے، ان کا رنگ اوپر سے سیاہ

---

[1] متن ص ۲۱، ترجمہ ص ۴۳، [2] متن ص ۲۰ ترجمہ ص ۴۲

ہو گیا تھا لیکن مزے میں کچھ فرق نہ آیا تھا، مکئی یا جوار بھی جو نکال رہے تھے۔ کہتے تھے کہ شاہ بلبن کے وقت جسے نوے سال ہوئے یہ غلّے بھرے گئے تھے۔ فصیل کے اوپر کئی سوار اور پیادے تمام شہر کے گرد گھوم سکتے ہیں۔ شہر کے اندر کی طرف گوداموں میں تا بداں ہیں جن میں سے روشنی پہونچتی ہے۔ اس فصیل کے نیچے کا حصہ تو پتھر کا بنا ہوا ہے اور اوپر کا حصہ پختہ اینٹوں کا۔ برج تعداد میں بہت اور قریب قریب ہیں[1]

امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غلاموں کے اخیر زمانہ میں تیرہ دروازے تھے اور سو کھڑکیاں۔

سیزدہ دروازہ وصد فتحباب[2] قرآن السعدین

برنی نے بارہ دروازے بنائے ہیں[3] اور تیمور نے دس[4]۔

اس منچلے بادشاہ نے اپنے محل کے لئے ایک نیا موقع چھانٹ کر ایک تیسرے دارالسلطنت کی بنیاد ڈالی۔ برنی نے لکھا ہے کہ فوجی ضرورتوں سے علاؤالدین نے سیری کا موقع جو پہلے سے چراگاہ و لشکر گاہ کے کام آتا تھا منتخب کیا۔ اور وہیں رہنے لگا تھا[5]۔ اس کے جانشین نے سیری کے محلات کی تکمیل کی اور ایک نیا حصار بنوایا، اور

---

[1] متن ص $\frac{19}{2}$ ترجمہ ص $\frac{38}{39}$، [2] ص ۲۹، [3] ص ۱۷۲، [4] تزک [5] ص ۳۰۲ فیروز شاہی۔

قصر ہزار ستون بھی غالباً اسی کے زمانہ میں بنا، شاہی محل میں کوئی زرین قصر بھی تھا جس کی تعریف امیر خسرو نے لکھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بادشاہوں کی تصویریں بھی تھیں، اور کوئی حوض بھی۔

قصر زر شاہ اے فلک فردوس نور افشاں نگر　　زارکاں دولت ہر وش دولت بجا ارکاں نگر
ایواں زر نیش از صفا آئینہ گو شد رو نما　　وز عکس شاہاں جا بجا تصویراں ایواں نگر
حوضش مصفا کوثرے قصرش گذشتہ از ثریٰ　　آب از مزہ جاں پرورے چوں شربت حیواں نگر

(نہایت الکمال)

ابن بطوطہ نے سیری کے شاہی محل اور شہر کا حال لکھا ہے[۱]۔ جسے محمد تغلق نے ابن الخلیفہ عباسی کو بخشدیا تھا۔ امیر خسرو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیری کی مسجد اور مینار بھی قطب الدین نے بنوائے تھے، اور سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ اس مسجد کی رسم افتتاح بڑے دھوم سے ہوئی تھی[۲]۔ ابن بطوطہ نے اس مسجد کی بڑی تعریف لکھی ہے اور افسوس ہے کہ وہ مکمل نہ ہونے پائی تھی۔

"سلطان قطب الدین خلجی نے ارادہ کیا تھا کہ وہ سیری میں ایک ایسی مسجد بنا دے لیکن فقط قبلہ کی طرف کے دیواروں اور محراب

۱؎ متن ص ۵۵ ترجمہ ص ۱۱۹، بنا یافت در صحن معبد نہاں ۔ ز عزت سخن با گہر گفت جاں

۲؎ سلطان قطب الدین جامع سیری عمارت کرد و در اول جمعہ ہمہ مشائخ را و علما را طلب کرد کہ نماز در مسجد نو بگذارید۔"

کے سوا نہ بنا سکا، اس نے سفید سرخ سبز اور سیاہ پتھروں سے تعمیر شروع کی تھی اگر بن جاتی تو ایسی مسجد کسی ملک میں نہ ہوتی، سلطان محمد نے اس کے بنانے کا ارادہ کیا تھا، اور معماروں اور کاریگروں سے اندازہ کرایا تھا، تو معلوم ہوا کہ اس میں پینتیس لاکھ روپیہ اور لگے گا۔ خرچ کثیر دیکھ کر اس نے ارادہ ترک کر دیا، لیکن بادشاہ کا ایک مصاحب کہتا تھا کہ فال بد سمجھ کر اس نے شروع نہیں کی۔ کیونکہ اس کا بانی اس کی بنوانے میں مر گیا تھا"۔[۱]

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قطب الدین سے پہلے اور بعد میں جب تک عباسی خلیفہ رہے، ہندوستان کے مسلمان بادشاہ انکی خلافت ماننے اور بادشاہت کے لئے اجازت چاہتے رہتے تھے لیکن قطب الدین خلافت کا خود مدعی تھا۔ اپنے آپ کو خلیفہ لکھتا اور سیری کو دارالخلافہ کہلوا تا تھا اور بعد میں بھی سیری اسی نام سے موسوم رہی[۲]

بہر حال سیری کے محلات دشہر عرصہ تک رہے اور حوض شمسی کے جواب میں علاؤالدین نے حوض خاص تعمیر کرایا تھا، جس کے آثار اب تک محفوظ ہیں اور فیروز شاہ کا مقبرہ اور مدرسہ اس کے کنارہ پہ بنے ہیں۔

عـ۱ متن ص ۱۴ ترجمہ ۴۳/۴۴ ، عـ۲ ابن بطوطہ ص ۱۹ متن "سیری وتسمی ایضاً دار الخلافۃ"۔

سیری کا محل وقوع عرصے سے زیر بحث ہے عام طور پر اسے شاہپور کے مطابق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ حوض خاص دہلی اور دار الخلافہ (سیری) کے درمیان میں تھا[۱] تیمور اور ظفر نامہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ شہر مدور تھا، شاہپور نہ مدور ہے نہ اس کے اور دہلی کے بیچ میں حوض ہے۔ جب تک کوئی زیادہ معتبر آثار یا کتبے دستیاب نہ ہوں اس وقت تک یہ مطابقت یقینی نہیں ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ سیری کا موقع حوض خاص سے بہت زیادہ دور نہیں ہو سکتا۔

اس زمانہ میں خلجی دور کی یادگاروں میں مدرسہ مسجد کے کھنڈروں کو چھوڑ کر قطب مینار کے قریب جانب شمال دروازہ علائی اور نظام الدین کی جامع مسجد میں جس کے متعلق اکبری دور کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ وہ خود سلطان جی کی بنوائی ہوئی ہے، اور اکبر نے اس کے باہر کا پتھر صاف اور چکنا کرایا تھا[۲] اس مسجد کا درمیانی حصہ جو یقیناً علائی دور کا ہے، اور بعض نے اسے شاہزادہ ظفر خاں کی طرف منسوب بھی کیا ہے، کاریگری آرائش اور ڈاٹ کے لداو اور کتبات و گلکاری کی نفاست سے فی الواقعہ بہت زیادہ قابل ستائش بلکہ بےمثل ہے، اسے اس دور کا بہترین بقیہ سمجھنا چاہیئے، دروازہ علائی کی ناز یبا مرمت نے اس کی خوشنمائی کو بڑا نقصان پہونچایا ہے، اس کے

---

[۱] متن ص ۲۲ "وفیما بین دهلی و دار الخلافہ حوض الخاص و هو اکبر من حوض السلطان"۔ [۲] ثمرات القدس قلمی،

دروازوں کے درمیانی حصے بازوؤں کے حصوں سے زیادہ اونچے تھے اور دیواروں کے اوپر خوشنما کنگرے بنے تھے۔ موجودہ حالت میں گنبد زیادہ نیچا اور غیر موزوں ہو گیا ہے، حالانکہ اس دور کے گنبد کا صحیح تناسب مسجد نظام الدین میں نظر آتا ہے۔ مسجد قطب کے پیچھے جو علاؤالدین کا مقبرہ و مدرسہ بتائے جاتے ہیں ان کے لئے کوئی سند نہیں ہے بلکہ برنی کے بتانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقبرہ غالباً اس حصہ مسجد کے دروں کے سامنے تھا، جسے علاؤالدین نے ماذنہ کے ساتھ تعمیر کرایا تھا[1]۔ اس میں شبہ نہیں کہ طرز تعمیر کے لحاظ سے مدرسہ کی عمارت غلاموں کے بعد کی معلوم ہوتی ہے لیکن کسی مخصوص بادشاہ سے اس کی صحیح نسبت مشکل ہے، طبقات ناصری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب یا اس سے ملا ہوا مدرسہ معزی تھا[2]۔ جو غالباً معزالدین غوری کے نام سے منسوب ہے۔

غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد بنوایا تھا، اور اس میں ایک سنہرا محل جسے امیر خسرو نے "منقش از زر ناب" لکھا ہے، اور اس کا حال ابن بطوطہ نے اس طرح بیان کیا ہے،

" اس شہر (یعنی تغلق آباد) میں بادشاہ کا خزانہ محل تھے اور ایک بڑا محل ایسا طیار کرایا تھا کہ اس کی اینٹوں پر سونا چڑھا تھا۔ جس وقت

---

[1] ضیائے برنی ص ۳۶۹ ودر ششم شوال آخر شب سلطان علاؤالدین را از کوشک سیری بیرون درند و در پیش مسجد جمعہ در مقبرہ او بردند و دفن کردند، [2] ص ۱۸۹ -

سورج طلوع ہوتا تھا اس کی دمک سے کوئی بھی اس محل کی طرف آنکھ
جما کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس میں بادشاہ نے بہت سامان جمع کیا تھا۔
کہتے ہیں کہ اس میں ایک حوض بنوا کر سونا پگھلا کر بھروا دیا تھا کہ وہ جم کر
ایک ڈلا ہو گیا تھا۔ اسکے بیٹے محمد تغلق نے وہ تمام سونا صرف کر دیا۔"[1]

اس زمانہ میں حصار دکو شک اور دیگر تمام عمارات تغلق آباد سب کھنڈر پڑے ہوئے ہیں صرف تغلق کا مقبرہ باقی ہے جو ابن بطوطہ کے بیان سے خود اسی بادشاہ نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا، اور اُسے فیروز شاہ نے دارالامن کے نام سے موسوم کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین دہلی اپنے مقابر اپنی زندگی میں تعمیر کرا لیتے اور ان کے متعلق وہی طریقہ حصول ثواب کا اختیار کرتے تھے جس کا ذکر بلبن کے مقبرۂ دارالامن کے بارہ میں ہو چکا ہے۔

اس مقبرہ کو علائی دروازہ مسجد نظام الدین کے وسطی درجہ سے، جو خلجیوں کے دور سے تعلق رکھتے ہیں مقابلہ کر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے تعمیر نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا تھا جس میں ہندی اثرات کو گھٹا کر زیادہ سادگی اور مضبوطی کو اختیار کر لیا گیا تھا، حتیٰ کہ خاص مقبرہ کتبات تک کی آرائش سے معرّیٰ ہے، جو غلاموں اور خلجیوں کے

---

[1] متن ص ۳۰۸ ترجمہ ۱۸۷

زمانہ میں کثرت سے کام میں لائے گئے ہیں،

محمد تغلق نے پہلے تغلق آباد اور بعد میں دولت خانہ میں رسم تخت نشینی ادا کرنے کے بعد نئی نئی تجویزیں سوچنی شروع کیں، دیوگیر کو دارالسلطنت قرار دیکر دہلی کی آبادی کو منتقل کردیا اور دہلی میں باہر والے لاکر بسائے۔ یہ ایک ایسا دھکا تھا جس سے دہلی بڑی مشکل سے پنپی۔ اس تبدیل وتحویل دارالسلطنت کے مفصل حالات میں ایک جداگانہ مقالہ جو جامعہ میں شائع ہوچکا ہے، لکھ چکا ہوں۔ اور اس لئے اس جگہ ان کا اعادہ بیکار ہے،

اپنے زمانہ میں محمد تغلق نے نیا شہر بسایا تھا جو سیری اور قدیم دہلی کے درمیان وسیع میدان کو گھیرتا تھا اور اس کا نام جہاں پناہ رکھا تھا۔ اس کی قدیم آثار میں سے حال میں کچھ نشانات ملے ہیں جنھیں ہزار ستون کی عمارت سے منسوب کیا جاتا ہے، اور غالباً بدیع منزل اور کھڑکی بیگم پور کی مساجد ہیں۔ جو میری رائے میں فیروز شاہ کے وزیر خانجہاں کے نام سے غلطی سے منسوب کی جاتی ہیں۔

محمد تغلق کے زمانہ میں دہلی کا مفصل حال ابن بطوطہ نے لکھا ہے۔ جسے تاریخ ہند و دہلی کے ہر طالب علم کو غور سے پڑھنا چاہیئے

مصر کے معاصر عرب مورخ صاحب مسالک الابصار نے دہلی کا جو حال لکھا ہے وہ سننے کے قابل ہے۔

میں نے شیخ مبارک سے شہر دہلی اور شاہی دربار کا حال پوچھا تو انہوں نے بیان کیا کہ دہلی کئی شہروں پر شامل ہے، جو ملا دئے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا جدا نام ہے، اور دہلی ان میں سے صرف ایک کا جو سب پر عاید ہو گیا ہے، وہ طویل و عریض ہے، اور تقریباً چالیس میل کا گھیر (دور) رکھتا ہے، مکانات پتھر اور اینٹ سے بنے ہوتے ہیں۔ جنکے فرش سفید پتھر سے جو سنگ مرمر کی طرح ہوتا ہے بنائے جاتے ہیں۔ کوئی مکان دو منزل سے زیادہ نہیں اور بعض صرف یک منزلہ۔

شیخ ابوبکر بن جلال کا بیان ہے کہ دہلی، ۲ شہروں کا مجموعہ ہے بارہ ہزار قدم تک اس کے تینوں طرف باغات ہیں، غربی سمت میں پہاڑی ہونے کی وجہ سے باغات نہیں ہیں۔ دہلی میں ایک ہزار مدارس ہیں جن میں سے صرف ایک شافعیوں کا ہے ورنہ سب حنفیوں کے ہیں۔ ستر شفا خانے ہیں، جو دار الشفا کہلاتے ہیں، خانقاہیں دو ہزار ہونگی۔ بہت سی وسیع خانقاہیں بہت سے کشادہ میدان اور بہت سے حمّام ہیں۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ دہلی کے شاہی محلات میں صرف بادشاہ بیگمات اور ان کے خدام و ملوک رہتے ہیں، کوئی خان و امیر وہاں نہیں رہتے، وہ صرف صبح اور دوپہر کو وہاں حاضر ہوتے ہیں۔

بدر چاچ کے قصائد سے جو کہ محمد تغلق کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ اور دوسرے مورخوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کے

تعمیر کئے ہوئے قصر کا نام قصر ہمایوں تھا۔

شدہ قصر ہمایونت چوں ایوان فلک — باہزاران خشت زرین طاق عالی ساختہ

(بدر چاچ)

دربار کی عمارت ہزار ستون کہلاتی تھی۔ قصر شاہی کا تذکرہ ابن بطوطہ نے اس طور پر لکھا ہے،

شاہی محل کو دہلی میں دار سرا کہتے ہیں، اس میں کئی دروازوں سے ہو کر جانا پڑتا ہے، پہلے دروازہ پر پہرہ کے سپاہی رہتے ہیں اور نفیری نقارے اور سرنا والے بھی اس دروازہ پر بیٹھتے ہیں پہلے اور دوسرے دروازے کے درمیان ایک بڑی دہلیز ہے، اس کے دونوں طرف چبوترے بنے ہیں اس پر نوبت نقارے والے بیٹھتے ہیں اور اس دروازہ پر پہرہ دار ہوتے ہیں دوسرے اور تیسرے دروازے کے درمیان ایک بڑا چبوترہ ہوتا ہے، اس پر نقیب النقبا بیٹھا رہتا ہے، اس کے ہاتھ میں طلائی چھڑی ہوتی ہے اور سر پر جڑاؤ اور طلا کار کلاہ۔ جس پر مور کے پر لگے ہوتے ہیں اور باقی نقیبوں کی کمر پر زریں پیٹی سر پر طلا کار ٹوپی اور ہاتھ میں تازیانہ ہوتا ہے۔ جس کا دستہ سونے یا چاندی کا ہوتا ہے۔ دوسرے دروازوں کے اندر ایک بڑا دیوان خانہ ہوتا ہے، جس میں عام لوگ بیٹھتے ہیں۔ تیسرے دروازے پر متصدی بیٹھے رہتے ہیں جن کا کام ہوتا ہے کہ کوئی شخص اندر نہ جاسکے، جب تک کہ ان

کے نام کتاب میں درج نہ ہو جائیں۔ ہر ایک امیر کے ہمراہیوں کی تعداد مقرر رد درج ہوتی ہے، متصدی اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ فلاں شخص اتنے ہمراہیوں کے ساتھ فلاں وقت آیا۔ بادشاہ روزنامچہ عشا کی نماز کے بعد ملاحظہ کرتا ہے...... [1]

ایک اور موقع پر لکھا ہے

جب ہم تیسرے دروازہ پر داخل ہوئے تو ہمیں ایک بڑا دیوانخانہ ملا، جس کا نام ہزار ستون تھا، اس میں بادشاہ جلوس عام کرتے ہیں[2]۔

ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ اس کے ستون لکڑی سے بنائے گئے تھے اور ان پر روغن ہو رہا تھا۔

فیروز شاہ تغلق کو تعمیرات کا بڑا شوق تھا۔ اس نے فیروز آباد کا شہر ۷۵۵ھ[3] میں آباد کرنا شروع کیا تھا۔ ایک برس پہلے جمنا کے کنارے کوشک کے قریب جامع مسجد اور حوض خاص بنوائے تھے۔ خاص کوٹلہ میں اشوک کے مینار کے پاس جو مسجد موجود ہے وہ جامع مسجد نہیں ہے۔ بلکہ قلعہ کی مسجد ہے۔ جیسا کہ آگرہ اور دہلی کے قلعوں میں بھی ہیں[4]۔

---

[1] متن ص ۴۱/۴۲، ترجمہ ۹۳/۹۴، [2] متن ص ۹۰۱ ترجمہ ص ۱۹۶۔
[3] مبارک شاہی ص ۱۲۵ [4] مبارک شاہی ص ۱۲۴،

اس شہر کے آباد ہونے کا ذکر اس دور کے مورّخ عفیف نے اس طرح لکھا ہے،

سلطان فیروز کو شہر فیروز آباد کے بسانے کا خیال ہوا۔ تو اس کو بنوانے کے لئے کوشش شروع کر دی، شہر دہلی کے جوار میں اکثر مقام شہر یاران، اہل کرام کے دیکھے تو آخر الامر دریائے جون کے کنارے موضع کادین کی زمین میں عمارتِ کوشک شروع کر دی، عہدہ داران عمارت وکاریگران بابصارت و مہارت اس عمارت میں مشغول ہو گئے۔ تمام امراء نے اپنے اپنے مکانوں کیلئے جگہیں چھانٹ لیں۔ شہر دہلی سے پانچ کوس پر ایک بڑا شہر آباد ہو گیا، کہتے ہیں کہ اٹھارہ موضعوں کی زمین حدود شہر فیروز آباد میں شامل ہوئیں۔۔۔۔۔

شہر فیروز آباد میں عنایت ربانی سے اتنی کثرت آبادی کی ہو گئی کہ قصبہ اندپت سے کوشکِ شکار تک پانچ کوس ہیں ان پانچ کوسوں میں ہر کوس آباد تھا۔ اتنی مساجد پنج وقتہ نماز کے لئے بن گئیں تھیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں۔ از انجملہ آٹھ موقعوں پر جامع مسجدیں تھیں ایک مسجد خاص (یعنی شاہی مسجد) دوخانجہاں کی بنائی ہوئی مسجد یں ایک شہر میں دوسری جاج نگر میں، ایک مسجد نائب باربک (یعنی فیروز شاہ کے بھائی) کی، ایک ملک بحر شحنہ نحفی کی ایک مسجد نظام الملک کی، ایک

مسجد کوشک شکار، ایک مسجد اندپت میں۔ اس طرح کل آٹھ جامع مسجدیں شہر فیروزآباد میں بن گئیں اور یہ سب مسجدیں نہایت بڑی تھیں اور اتنی باوسعت کہ ہر ایک میں دس ہزار نمازی نماز پڑھ سکتے تھے۔

عجب یہ ہے کہ پورے چالیس برس کی مدت میں کہ اس شہر بارخوش خصال کا دور رہا۔ شہر دہلی اور فیروزآباد کے درمیان پانچ کوس کا فاصلہ پڑتا تھا، مگر ہر روز بیشتر خلایق اپنی ضروریات و تعلقات کے باعث دہلی سے فیروزآباد آتے اور فیروزآباد سے دہلی جاتے رہتے تھے، صبح کی نماز کے وقت ی آنے جانے کے لئے گاڑیاں چوپائے اور گھوڑے تیار رہتے تھے۔ جیوں ہی کوئی چاہتا تو گاڑی چوپایہ یا گھوڑے پر حسب پسند سوار ہو کر مقررہ کرایہ ادا کر دیتا اور جلد اپنے مقام پر پہونچ جاتا۔ کہار ڈولے لئے کھڑے رہتے تھے جو چاہتا ڈولے میں سوار ہو کر جاتا۔ گاڑی کا کرایہ فی کس چار جیتل تھا۔ چوپایہ کا چھ جیتل گھوڑے کا ۱۲ جیتل، اور ڈولے کا آدھا ٹنکہ۔ اسی طریقہ پر چالیس برس تک راستہ چلتا رہا۔ آس پاس کے مزدوروں کی کام کی وجہ سے اچھی گذر ہوتی رہی"[۱۰]

علاوہ اس کوشک کے دو کوشک اور تھے، کوشک شکار

---

[۱۰] فیروز شاہی عفیف ص ۱۳۴ - ۱۳۶

اور کوشک نزول جن کے نشانات مٹ چکے ہیں۔ کوشک شکار کا موقع
اشوک کے دوسرے لاٹ سے متعین ہوتا ہے، جو فیروز شاہ نے وہاں
نصب کرادیا تھا[عہ۱]، کوشک نزول میں شب برات کا جشن منایا جاتا، اور
اس کے قریب عیدین کی نمازیں ہوتی تھیں[عہ۲]۔

فیروز شاہی دور کے آثار میں کوٹلہ، اشوک کے منارے جو دہلی میں
فیروز شاہ کے نصب کرائے ہوئے ہیں[عہ۳] مسجد کلاں (کالی مسجد) جو شاہجہاں آباد
میں وزیر جاں جہاں بن خانجہاں کی بنوائی ہوئی باقی رہ گئے ہیں، اور حوض خاص
پر مدرسہ فیروزی کی کچھ عمارات۔

تیمور کے حملے کے وقت دہلی اپنے انتہائی عروج و وسعت کو پہنچ
چکی تھی تیمور نے (اور اس کے مورخ نے) ان کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ سیری
گول شہر ہے اس کی عمارات بلند ہیں، جو ایک قلعہ سے گھری ہوئی ہیں
جسے اینٹ اور پتھر سے بنایا گیا ہے اور نہایت مستحکم ہے۔ پرانی دہلی
میں بھی ایسا ہی مضبوط حصار ہے لیکن وہ سیری سے بڑا ہے۔ سیری کے قلعہ
سے پرانی دہلی تک بڑا فاصلہ ہے ایک دیوار چونہ اور پتھر سے بنی ہوئی انہیں

عہ۱ فیروز شاہی عفیف ص ۳۵ ، عہ۲ فیروز شاہی عفیف ص ۳۶۴/۳۶۵ -
عہ۳ مفصل حالات دیکھو تاریخ عفیف ص ۳۰۵ - ۳۱۵)

ملاتی ہے، یہ حصہ جہاں پناہ کہلاتا اور شہر آباداں کے وسط میں واقع ہے۔ ان تینوں شہروں کی شہر پناہوں میں کل تیس دروازے ہیں۔ جہاں پناہ میں تیرہ، جانب جنوب و شرق اور چھ جانب شمال و مغرب، سیری میں سات دروازے ہیں، چار باہر کی طرف اور تین جہاں پناہ کی طرف، دہلی کے قدیم حصار میں دس دروازے ہیں، کچھ باہر کی طرف کھلتے ہیں اور کچھ اندر شہر کی طرف۔"

فیروز آباد جمنا کے کنارہ پر واقع ہے اور فیروز شاہ کا بنوایا ہوا ہے۔ وہاں کی جامع مسجد میں میں نے نماز شکرانہ ادا کی اور بعد ازاں کوشک جہاں پناہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔

ظفر نامہ کا مصنف لکھتا ہے:۔

۸ ربیع الثانی (مطابق ۷ دسمبر ۱۳۹۸ء) کو تیمور نے دہلی کی دیوار پر فتح کا پرچم لہرادیا۔ وہ دروازہ میدان کی طرف تھا، اور عید گاہ میں بیٹھ گیا۔ یہ دروازہ جہاں پناہ کا ہے، اور حوض خاص کی طرف کھلتا ہے رخصت ہونے سے پہلے تمام سادات قاضی علماء و مشایخ کو جہاں پناہ کی جامع مسجد میں جمع کیا تھا۔... ... ۲۲ ربیع الاول ۸۰۱ھ کی صبح کو تیمور نے روانگی شروع کی اور تین کوس چل کر فیروز آباد پہونچا اور مسجد فیروز آباد میں گیا جو ترشے ہوئے پتھروں سے دریا کے کنارے بنی ہے اس کے بعد اس نے وزیر آباد کے پاس جہاں نما کے پاس پڑاؤ کیا دہلی

سے وزیر آباد کا فاصلہ ۶ کوس ہے"۔

تیمور کے ہاتھوں دہلی کی تباہی کا واقعہ ۱۶ ربیع الثانی کو پیش آیا۔ ۱۷ کو جہاں پناہ اور سیری کے بہت سے محلات برباد کر دیئے گئے ۱۸ کو بھی لوٹ مار جاری رہی۔ ۱۹ کو تمام پرانی دہلی لٹی۔ شہر کے اسیروں میں ہزاروں صناع اور اہل ہند سمرقند لے جانے کے لئے چھانٹ لئے، اور ان میں سے سمرقند کی جامع مسجد کے لئے معمار منتخب کر لئے گئے۔[۱]

اس دردناک سانحہ کو یاد کر کے فیروز شاہی کا مصنف عفیف بصد حسرت و یاس لکھتا ہے۔

سبحان اللہ اتنا بڑا، معمور و آباداں شہر جیسا کہ آسمان کے نیچے دارالملک دہلی کا تختگاہِ باجاہ ہے، تقدیر ازلی اور حاکم لم یزلی سے اتنے طریقوں پر خراب ہو گیا اور اس دیار کی خلایق حضرتِ کردگار کے حکم سے مغلوں کی لوٹ میں چلی گئی اور جو باقی رہی وہ اطراف میں منتشر ہو گئی۔ یہ سب خدا کی حکمتیں ہیں، دم مارنے کی جگہ نہیں ہے"[۲]

سچ ہے قدرت عجیب طریقوں سے کام کرتی ہے۔ اس وقت

۱؎ تیمور کے وقت کے یہ حالات تزک و ظفرنامہ پر مبنی ہیں۔ ۲؎ ص ۱۳۶ -

کون کہہ سکتا تھا کہ اسی تیمور کی نسل سے دو سو ڈھائی سو برس پیچھے شاہجہاں ہوگا۔ جو دہلی کو نئے طور سے بسائیگا اور اپنا نام یادگار چھوڑ جائے گا۔